بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور جدید عالمی پس منظر میں ☆

سید جلال الدین عمری

اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کے فرق اور ان کے تعلقات کی نوعیت کو واضح کرنے کے لیے ہمارے علماء وفقہاء نے جو اصطلاحات استعمال کی ہیں، ان میں دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات بھی ہیں۔ یہ اپنے اندر بڑے وسیع معانی رکھتی ہیں اوران سے اسلامی سیاست کے بعض اہم گوشوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

فقہائے کرام کے نزدیک دارالاسلام وہ ریاست ہے جہاں اسلام کے احکام علانیہ (بغیر کسی رکاوٹ کے) نافذ ہوں۔ اس سے عبادات ہی نہیں، بلکہ اجتماعی اور سیاسی احکام بھی مراد ہیں۔ اس میں بعض فقہاء نے یہ اضافہ کیا ہے کہ دارالاسلام وہ ہے جہاں مسلمانوں کو امن وامان حاصل ہو اور وہ بے خوف وخطر زندگی (داخلی طور پر) گزار سکیں۔ اور دارالحرب وہ ہے جہاں علانیہ احکام کفر پر عمل ہو رہا ہو۔ اس کے ساتھ ایک شرط یہ بھی لگائی جاتی ہے کہ جہاں اہل کفر کا غلبہ ہو اور مسلمان امن وامان کی زندگی نہ بسر کرسکتے ہوں۔

دارالاسلام اور دارالحرب سے متعلق احکام بھی فقہاء نے تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱- دارالاسلام کی حفاظت اس کے مسلمان شہریوں کے لیے عام حالات

☆ ۱۹ تا ۲۱ مارچ ۲۰۰۵ء بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان میں 'اجتماعی اجتہاد' کے موضوع پر ایک سہ روزہ سمینار ہوا تھا۔ یہ مقالہ ۲۰ مارچ کو اس سمینار میں پڑھا گیا۔ اب اسی کو معمولی حذف واضافہ کے بعد یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

میں فرض کفایہ ہے، لیکن بعض نازک حالات میں اس کی حیثیت فرض عین کی ہو جاتی ہے۔ اس کے دفاع کے لیے نفیرِ عام (یعنی امام یا سربراہِ مملکت کی طرف سے جہاد کا اعلان) ہو تو ہر ایک کے لیے اس میں شرکت لازمی ہے۔ اس سے وہی افراد مستثنیٰ ہوں گے جو عذر شرعی رکھتے ہوں۔

۲- دارالاسلام سے بغاوت جائز نہیں ہے۔ اسے فرو کرنے کے لیے ہر ایک کو حسبِ استطاعت حصہ لینا ہوگا۔

۳- دارالحرب کے مسلمانوں کو اساسات دین پر عمل کی آزادی نہ ہو تو ان پر فرض ہے کہ دارالاسلام ہجرت کر جائیں۔ دارالاسلام کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے۔

۴- دارالحرب کا کوئی غیر مسلم شہری اسلام کو جاننے اور سمجھنے کے لیے دارالاسلام آنا چاہے تو اسے اس کا مناسب موقع فراہم کیا جائے گا۔ اس کے بعد اسے بہ حفاظت اس کے وطن پہنچا دیا جائے گا۔

۵- دارالحرب سے کوئی غیر مسلم تجارت یا کسی جائز مقصد سے دارالاسلام آنا چاہے تو اسے ایک محدود مدت کے لیے اجازت دی جاسکتی ہے۔ زیادہ دنوں تک وہ قیام کرے تو اسے ذمی قرار دیا جائے گا اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ ہوگا۔

٦- دارالاسلام کا کوئی شہری دارالحرب جائے تو وہ اس کے عام ملکی قوانین کا پابند ہوگا۔ جھوٹ، دھوکا، فریب یا کسی طرح کی غیر اخلاقی حرکت کی اسے اجازت نہ ہوگی۔ دارالحرب میں طویل قیام اور شادی بیاہ اس کے لیے ناپسندیدہ ہے۔

ان احکام پر موجودہ حالات کے پس منظر میں گفتگو سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کے تعلق کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس کی نوعیت رسول اللہ ﷺ کی سنت اور طریقۂ کار سے واضح ہے۔ آپ نے عرب کے مختلف سرداران قبائل کو براہ راست یا اپنے نمائندوں کے واسطہ سے اور مکاتیب کے ذریعے مختلف بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دی۔ اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں اسلامی اقتدار کو تسلیم کرنے اور جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ بھی منظور نہ ہو تو ان سے جہاد کا اعلان فرمایا۔

حضرت بریدہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا لقیت عدوک من المشرکین فادعھم الی ثلاث خصال فایتھن ما اجابوک فاقبل منھم و کف عنھم. ثم ادعھم الی الاسلام فان اجابوک فاقبل منھم و کف عنھم ... فان ھم ابوا فسلھم الجزیة. فان ھم اجابوک فاقبل منھم و کف عنھم فان ھم ابوا فاستعن باللہ و قاتلھم [۱]

جب تمہارا سامنا اپنے دشمن مشرکوں سے ہو تو انھیں تین باتوں کی دعوت دو۔ ان میں سے جس بات کو بھی وہ اپنے لیے پسند کریں تم اسے قبول کرلو اور ان سے ہاتھ روک لو۔ پہلے انھیں اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ اسے اختیار کرلیں تو اسے تسلیم کرلو اور ان سے جنگ سے باز رہو۔ اگر وہ انکار کریں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو۔ اگر وہ اس کے لیے تیار ہو جائیں تو اسے مان لو اور جنگ سے باز رہو۔ لیکن اگر وہ اس کے لیے بھی آمادہ نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ سے نصرت طلب کرو اور ان سے جنگ کرو۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، کسریٰ کے گورنر (جس کا نام بندار اور لقب غالباً ذو الجناحین تھا) سے کہتے ہیں:

امرنا نَبِیُّنَا رسول ربنا صلی اللہ علیہ وسلم ان نقاتلکم حتی تعبدوا اللہ وحدہ او تؤدّوا الجزیة۔[۲]

''ہمارے نبی اور ہمارے اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم سے جنگ کریں، جب تک کہ تم اللہ واحد کی عبادت نہ اختیار کرلو یا جزیہ ادا کرو۔''

دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور اسی سے ابھرا ہے۔ اس کا تعلق خاص حالات سے ہے۔ دار کی صرف یہی دو شکلیں نہیں ہیں۔ اسلامی ریاست کا دوسری ریاستوں سے معاہدۂ امن بھی ہوسکتا ہے۔ قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ میں اس کا ثبوت موجود ہے۔ اس کا حوالہ آگے آرہا ہے۔

---

[۱] مسلم، کتاب الجھاد، باب تأمیر الامام الامراء علی البعوث الخ. ابوداؤد، کتاب الجھاد، باب فی دعاء المشرکین

[۲] بخاری، کتاب الجزیة والموادعة، باب الجزیة والموادعة الخ

دورِ حاضر کے لیے دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور ہی ناقابلِ قبول ہے۔ یہ آج کے سیاسی مسلمات کے بالکل خلاف ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ مسلّمات کیا ہیں اور کس حد تک مبنی برحقیقت ہیں۔ دارالاسلام اور دارالحرب کے تصور سے ان کا تصادم ہے یا نہیں اور ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب اور نظریات پر اپنا غلبہ اور تسلط چاہتا ہے۔ دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور اسی کا شاخسانہ ہے۔ آج کی دنیا کسی ایسی ریاست کو قبول نہیں کرسکتی، جس کے پیشِ نظر دوسری ریاستوں پر اپنی بالادستی اور حکم رانی قائم کرنا ہو، بجا کہ وہ اس کے لیے عملی اقدامات بھی کرے۔

آج سیاست کی دنیا میں بعض باتوں پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ یہ اتفاق اقتدار کی کشمکش، اس کے نتائج اور قوموں کے کشت وخون کے طویل تجربات کے بعد ہوا ہے۔ یہ ایک تاریخی عمل ہے جسے نظر انداز کرنا آج کے دور میں ممکن نہیں ہے۔ جن سیاسی امور پر اتفاق ہے وہ یہ ہیں:

۱- کسی ملک کا دوسرے ملک پر قبضہ ناروا ہے۔ یہ ایک طرح کا نوآبادیاتی نظام ہے، جو ماضی کی داستان بن چکا ہے۔ اسے زندہ کرنے کی ہر کوشش قابلِ مذمت ہے۔

۲- ہر ملک اپنے معاملات طے کرنے میں آزاد ہے۔ اس کے اقتدارِ اعلیٰ کا احترام لازم ہے اور اسے چیلنج نہیں کیا جائے گا۔

۳- اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ ہوگی۔

۴- اس پر کوئی دوسرا ملک اپنے نظریات مسلّط کرنے اور اسے ان کا پابند بنانے کی کوشش نہ کرے گا۔

۵- کسی بھی ملک میں جو تبدیلی آئے وہ جمہوری اور آئینی طریقے سے آنی چاہیے۔ اس کے لیے جبر اور طاقت کا استعمال درست نہیں ہے۔

۶- مذہب فرد کا معاملہ ہے۔ اس کی بنیاد پر ریاست کے قیام کا جواز نہیں ہے۔

۷- دنیا کے تمام آزاد ممالک بین الاقوامی قوانین کے پابند ہوں گے۔

آ یئے دیکھیں کہ ان مسلّمات کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کس حد تک قابل عمل ہیں اور ان کی کہاں تک پابندی ہو رہی ہے؟ اور اس سلسلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

پہلے اس خیال کو لیجئے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور دوسروں پر اسلام کے غلبہ اور اقتدار کا تصور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام غلبہ اور اقتدار چاہتا ہے۔ اس کا صاف اعلان ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (التوبۃ:۳۳)	وہ اللہ ہی ہے، جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے، چاہے یہ مشرکوں کو نہ گوارا ہی گزرے۔

اسلام اگر اپنے اس عزم و ارادے کا اظہار کرتا ہے کہ وہ دوسرے ادیان اور نظامہائے حیات پر غالب آنا چاہتا ہے تو اس پر اعتراض کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ دنیا کا ہر نظریہ دوسرے نظریات پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے سعی و جہد بھی کرتا ہے۔ کمیونزم دنیا پر اپنے غلبہ کی کوشش کرتا رہا ہے۔ سرمایہ داری شب و روز اسی تگ و دو میں ہے اور بظاہر کامیاب ہے۔ اسلام بھی ایک نظریۂ حیات ہے۔ وہ غلبہ چاہتا ہے تو اسے غلط کہنے کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے۔

یہ بات کہ کسی ملک کے اقتدار اعلیٰ کو چیلنج نہیں کیا جائے گا، کوئی اصول کلیہ نہیں ہے، جو بات دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ اقتدار اعلیٰ صحیح اصولوں پر قائم ہے یا اس کی اساس ہی نادرست اور غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت اگر آمریت اور بادشاہت کو چیلنج کرے اور ختم کرنے کی کوشش کرے تو اسے ناروا نہیں، بلکہ پسندیدہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس اقتدار کی بنیاد ظلم و زیادتی، انسانی حقوق کی پامالی اور باطل افکار اور باطل نظام پر ہے اور وہ برضا و رغبت اس سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے تو اسے چیلنج کرنا چاہیے۔ قرآن مجید نے اس سلسلے میں اصولی بات یہ کہی ہے:

بَلْ نَقْــذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُــهُ فَإِذَا هُــوَ زَاهِــقٌ (الانبیاء:۱۸)	بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے۔ پھر وہ ختم ہو جاتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل:۸۱)	اور کہو کہ حق آیا اور باطل بھاگ کھڑا ہوا، بے شک باطل بھاگنے ہی والا ہے۔

یہ بات کہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ ہوگی، اس پر منحصر ہے کہ اس ملک کا رویہ اپنی آبادی اور باہر کی دنیا کے ساتھ کیا ہے؟ وہ کس قسم کی اقدامات کر رہا ہے؟ اور اس کے عزائم کیا ہیں؟ اگر اس کا رویہ نوعِ انسانی کے لیے خطرناک ہے تو دنیا کا فرض ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑے اور اسے اپنے عزائم کو روبہ عمل لانے اور پیش قدمی کرنے نہ دے۔ اسلام اس میں قائدانہ کردار ادا کرنا چاہتا ہے اور کرے گا۔ ہاں اگر اس کے یہاں عدل و انصاف ہے، حقوق انسانی کی پاس داری ہے، فکر و عمل کی آزادی ہے تو اس سے تعرض کرنا صحیح نہ ہوگا۔

یہ اصول کہ کوئی ملک دوسرے ملک پر اپنے خیالات مسلّط نہیں کرے گا، بالکل درست ہے۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ خیالات کا مسلّط کرنا تو بلاشبہ غلط ہے، لیکن تبادلۂ خیالات غلط نہیں، بلکہ بہت ضروری ہے۔ اس سے ذہن وفکر کے دریچے کھلتے ہیں اور حق و باطل واضح ہوتا ہے۔ کسی فکر کو جغرافیائی حدود کا پابند بنانا حریتِ فکر کے منافی ہے۔ اس وقت مغربی افکار پوری دنیا میں پھیلائے جا رہے ہیں اور اس طرح پھیل رہے ہیں جیسے حق و صداقت ان ہی میں منحصر ہے۔ اسے غلط نہیں کہا جا رہا ہے، بلکہ ہر ملک پوری فراخ دلی سے ان کا استقبال کر رہا ہے۔ اسلام اپنے عقیدہ اور فکر کو مسلّط کرنا نہیں چاہتا، بلکہ دلائل کے ساتھ اسے پیش کرتا اور اس پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اس نے صراحت کے ساتھ کہا ہے:

کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُو الْاَلْبَابِ○ (صٓ:۲۹)	یہ کتاب ہم نے آپ پر اتاری ہے جو بابرکت ہے، تاکہ یہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور عقل مند نصیحت حاصل کریں۔

یہ مضمون بہت سی آیات میں بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دعویٰ رسالت اور آپ کی تعلیمات کے متعلق ارشاد ہے:

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَابِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ○ (الأعراف:۱۸۴)	کیا انھوں نے نہیں سوچا کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو صاف صاف ڈرانے والا ہے۔

یہ ضابطہ کہ کسی بھی ملک میں جو تبدیلی آئے وہ جمہوری اور آئینی طریقے سے آنی چاہیے، اس کے لیے جبر اور طاقت کا استعمال درست نہیں ہے، اسلام اسے صحیح قرار دیتا ہے۔ اس نے آمریت کی جگہ شورائیت کی تحسین کی ہے اور اہلِ ایمان کا ایک اعلیٰ وصف یہ قرار دیا ہے کہ وہ اپنے معاملات مشورے سے طے کرتے ہیں: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ:۳۸) خلفائے راشدین کا انتخاب اسی اصول کے تحت ہوا۔ تاریخ کی شہادت ہے کہ اس دور میں سب ہی اہم امورِ ریاست باہم مشورے سے طے ہوتے تھے۔ آج اس کی جو مناسب صورت اختیار کی جائے وہ اسلام کے خلاف نہ ہوگی، بلکہ اسے اسلام کی تائید حاصل ہوگی۔

اب مذہبی ریاست کے سوال کو لیجئے:

موجودہ دور کا یہ رجحان یا فیصلہ غیر علمی اور غیر منطقی ہے کہ مذہب کو ریاست سے الگ ہونا چاہیے اور مذہب کی اساس پر ریاست کی تشکیل صحیح نہیں ہے۔ یہ انسان کو مذہب سے دور رکھنے اور اسے لامذہبیت اور دہریت کے رُخ پر ڈالنے کی کوشش ہے۔ اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کے سامنے یہ وسیع کائنات ہے، جس میں وہ سانس لے رہا اور زندگی گزار رہا ہے اور خود اس کا وجود اور اس کی ذات ہے۔ ان کے بارے میں بعض بنیادی سوالات ابھرتے ہیں۔ ان سوالات کا تعلق عقیدہ و فکر، عبادت و

اطاعت، اخلاق وسیرت، تہذیب و معاشرت، معیشت وسیاست اور زندگی کے ہر گوشے سے ہے۔ وہ ان کا متعین جواب چاہتا ہے۔ ان کا ایک جواب سیکولر نظریات دیتے ہیں۔ دوسرا جواب اسلام دیتا ہے۔ اگر سیکولر نظریات قابلِ غور ہو سکتے ہیں تو اسلامی فکر کیوں قابلِ غور نہ ہو؟ اسے محض اس وجہ سے رد کر دینا کہ وہ ایک مذہب ہے (حالاں کہ اسلام عام معنی میں مذہب نہیں، ایک فلسفۂ حیات ہے) ضد اور ہٹ دھرمی یا ذہنی تعصب کی دلیل ہے۔ کوئی بھی غیر جانب دار شخص اس کی تائید نہیں کر سکتا۔

بین الاقوامی معاہدوں کے احترام اور ان کی پابندی کی تعلیم شاید سب سے پہلے اسلام ہی نے دی ہے۔ اس نے تاکید کے ساتھ کہا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدۃ:۱)	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، معاہدوں کو پورا کرو۔

آیت میں 'عقود' کا لفظ آیا ہے۔ اس میں جس طرح اللہ اور بندے کے درمیان ہونے والے عہد و پیمان شامل ہیں اسی طرح وہ عہد و پیمان بھی اس میں آتے ہیں جو افراد اور جماعتوں کے درمیان ہوں۔

بین الاقوامی معاہدوں کے سلسلہ میں اسلام نے بعض اصول ہدایات دی ہیں۔

۱- عہد و پیمان جنگ بندی اور امن و امان کے لیے ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر بے خوف وخطر قبول کر لینا چاہیے۔

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ وَ اِنْ یُّرِیْدُوْۤا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ○ (الانفال:۶۱-۶۲)	اگر وہ امن وصلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ سننے اور جاننے والا ہے۔ اگر وہ تمھیں دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تمھارے لیے کافی ہے۔ اس نے (اس سے پہلے) تمھیں اپنی نصرت اور اہلِ ایمان کے ذریعہ تقویت پہنچائی ہے (وہ اب بھی تمھیں طاقت عطا کرے گا)

۲- فریق ثانی جب تک عہد شکنی نہ کرے، عہد کی لازماً پابندی کی جائے۔
مشرکینِ قریش کے بارے میں قرآن نے کہا کہ ان سے عہد و پیمان پورا کرنے کی توقع نہیں ہے۔ اس کے باوجود حکم ہوا۔

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (التوبۃ:۷)	پس جب تک وہ سیدھے طریقے سے اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھا طریقہ اختیار کرو (عہد کی پابندی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو) بے شک اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔

۳- معاہدہ کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہو تو اسے ختم کیا جاسکتا ہے، لیکن فریق ثانی کو دھوکے میں نہ رکھا جائے، بلکہ علی الاعلان اسے ختم کیا جائے۔

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۝ (الانفال:۵۸)	اگر تمھیں کسی قوم سے عہد و پیمان میں خیانت (بدعہدی) کا خوف ہو تو اسے اس طرح پھینک دو کہ تم اور وہ برابر کی حیثیت میں آ جائیں، (دونوں پر واضح ہو جائے کہ اب معاہدہ ختم ہو گیا ہے۔ خیانت نہ کرو) بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

بین الاقوامی معاہدوں کے سلسلے میں اس سے زیادہ معقول اور امن پسندانہ رویہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کے تصور پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں سے بیش تر موجودہ دور کے طرزِ عمل پر وارد ہوتے ہیں۔ وہ جس رویہ کو اپنے لیے جائز قرار دیتا ہے اسے دوسروں کے لیے جائز نہیں سمجھتا۔

ان اعتراضات سے قطع نظر اس پورے موضوع پر موجودہ حالات میں بعض اور

پہلوؤں سے غور وفکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ (فداہ أبی و اُمّی) نے جن حالات میں عرب کے سردارانِ قبائل سے خطاب فرمایا تھا یا جو مکاتیب غیر اسلامی ریاستوں کے سربراہوں کے نام ارسال فرمائے تھے انھیں پیش نظر رکھنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اُس وقت کے حالات اور آج کے حالات میں کیا فرق واقع ہوا ہے؟

۱- وہ دور شہنشاہیت اور آمریت کا تھا۔ بادشاہِ وقت اقتدار کا مرکز اور آمرِ مطلق ہوتا۔ وہ اپنے وزراء واعوان اور حوالی موالی کی مدد سے جس طرح چاہتا حکومت کرتا۔ وہ نہ تو خود کو کسی کے سامنے جواب دہ سمجھتا اور نہ کسی کو اس سے باز پرس کی ہمت ہوتی۔ عوام حقیقی معنی میں کالانعام اس کے احکام کی تابع داری کرتے۔ امورِ ریاست میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوتا۔ سردارانِ قبائل اور مطلق العنان آمروں کا بھی یہی طریقہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اسی وجہ سے سردارانِ قبائل اور بادشاہانِ وقت سے خطاب کیا اور انھیں اسلام لانے کی دعوت دی۔ اس لیے کہ ان کے اسلام قبول کرنے کے معنی عوام کے اسلام قبول کرنے کے تھے اور ان کا رد کردینا عوام کے رد کردینے کے مترادف تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے شاہِ روم ہرقل کو جو خط روانہ کیا اس میں آپؐ نے فرمایا:

أُسلم، تسلم، اسلم یؤتک اللہ أجرک مرّتین و إن تولّیت فإنّ علیک إثم الأریسین [۱]	اسلام لاؤ سلامتی سے رہوگے۔ اسلام لاؤ، اللہ تعالیٰ تمھیں دُگنا اجر عطا کرے گا۔ اگر تم نے اس سے بے رخی برتی تو تم پر کسانوں (رعایا) کا بھی گناہ ہوگا۔

بادشاہ اگر انکار کردے تو رعایا کا گناہ بھی اس پر اس لیے عائد ہوگا کہ وہ دین و مذہب اور عقیدہ وفکر میں اس کے تابع تھے۔ وہ اسلام قبول کرلے تو رعایا بھی لازماً اسلام

[۱] مسلم، کتاب الجہاد

قبول کرلے گی۔ وہ اگر رد کردے تو رعایا بھی سے رد کردے گی۔[۱]

عصر جدید نے صورتِ حال بدل دی ہے۔ قبائلی حکم رانی اور بادشاہت اور آمریت کا دور بڑی حد تک قصۂ پارینہ بن چکا ہے، یا بنتا جارہا ہے۔ یہ دور عوام کے اقتدار کا ہے۔ اس لیے اب اسلام کا خطاب بھی کسی مخصوص فرد یا طبقے تک محدود نہ ہوگا اور ان کا فیصلہ عوامی فیصلہ نہیں کہلائے گا۔ خاص طور پر جہاں عقیدے اور فکر اور نظامِ سیاست میں بنیادی اور دوررس نتائج کی حامل تبدیلی کا سوال ہو۔ اس کے لیے اس ملک کے عوام سے خطاب کرنا ہوگا۔ کسی اونچے سے اونچے فرد یا گروہ سے خطاب کے ذریعہ پوری قوم پر دعوتی حجت پوری نہ ہوگی اور اس کے خلاف طاقت کے استعمال کا غالباً جواز نہ ہوگا۔

۲- عہد رسالت اور اس سے قریب کے دور میں ایک طرف دارالاسلام یا اسلامی ریاست تھی، جہاں اسلام اپنے عقیدے اور فکر، اپنے اخلاق، اپنی معاشرت، تہذیب و تمدن اور اپنے سیاسی نظام کے ساتھ موجود تھا اور اپنے پورے وجود سے اسلام کی ترجمانی کررہا تھا۔ دوسری طرف غیر اسلامی ریاستیں یا بہت سے دارالحرب تھے، جہاں احکامِ کفر نافذ تھے۔ دونوں کا فرق آسانی سے سمجھا جاسکتا تھا۔ اب کوئی دارالاسلام نہیں ہے۔ بہت سے مسلم ممالک ہیں، جن میں سے کسی ملک میں اسلام کی حکم رانی صرف عبادات اور شخصی امور تک محدود ہے اور کہیں نسبتاً اس سے وسیع دائرے میں اس پر عمل ہورہا ہے۔ اسلام کا نفاذ پوری تفصیلات کے ساتھ کہیں نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ان میں سے ہر ملک اپنی جگہ خود مختار اور اپنی سیاسی پالیسی اور حکمت عملی میں آزاد ہے۔ ان کا کوئی مشترکہ وفاق بھی نہیں ہے جو غیر اسلامی ریاستوں کے سامنے اسلام کے تقاضے اور

---

[۱] امام نوویؒ فرماتے ہیں: معناہ أنّ علیک إثم رعایاک الذین یتبعونک وینقادون بانقیادک ونبّہ بھولاء علی جمیع الرعایا، لأنھم الأغلب ولأنّھم أسرع انقیاداً. فاذا أسلم أسلموا، واذا امتنع امتنعوا وھذا القول ھو الصحیح (شرح مسلم، جلد ۶، جزء ۱۲، ص ۹۳، دارالکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۵ء) اس کے معنی یہ ہیں کہ تم پر تمھاری رعایا کا بھی گناہ ہوگا، جو تمھارا اتباع کرتے ہیں اور جو تمھارے اطاعت قبول کرنے سے خود بھی مطیع ہوجائیں گے۔ 'اریسیین' (کاشت کاروں) سے تمام رعایا کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس لیے کہ ان ہی کی اکثریت تھی اور سب سے بڑھ کر اطاعت کرنے والے بھی وہی تھے۔ اگر بادشاہ اسلام لے آئے تو وہ بھی اسلام لے آئیں گے اور وہ اس سے باز رہے تو وہ بھی باز رہیں گے۔

مطالبات رکھ سکے۔

۳- اس وقت دارالاسلام وقت کی ایک غالب قوت تھا اور وہ دوسری ریاستوں سے اپنی شرائط پر بات کرسکتا تھا، لیکن آج کوئی اسلامی ریاست اس موقف میں نہیں ہے، بلکہ وہ دوسری طاقتوں کے زیرِ اثر ہے۔

دارالاسلام اور دارالحرب کے جو احکام بیان ہوئے ہیں وہ اپنے وقت میں قابلِ عمل تھے اور ان پر عمل ہو بھی رہا تھا لیکن موجودہ بین الاقوامی حالات ان میں سے بعض احکام پر مزید غور وفکر کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہاں ان کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے:

۱- دارالحرب میں اگر اسلام کے اظہار اور اس پر عمل کی آزادی نہ ہوتو وہاں کے مسلمانوں پر دارالاسلام ہجرت کرجانا فرض ہے۔ لیکن اب یہ صورت حال غالباً صرف بعض کمیونسٹ ممالک میں رہ گئی ہے۔ اس سے قطع نظر غور طلب امر یہ ہے کہ ہجرت کے لیے دارالاسلام کا ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے دروازے مہاجرین کے لیے کھلے ہوں۔ مسئلہ دو چار افراد کا نہیں، بلکہ اس طرح کے ممالک میں موجود پوری امت کا ہے۔ اس کے لیے کیا آج کوئی دارالاسلام یا مسلم ملک تیار ہے؟

۲- جہاں تک غیر مسلم جمہوری ممالک کا تعلق ہے ان میں تمام باشندگانِ ملک کے مساوی حقوق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے درمیان کسی طرح کے فرق و امتیاز کو صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ ان ممالک میں مسلمان ان تمام سیاسی حقوق کے ساتھ رہ رہے ہیں جو غیر مسلم شہریوں کو حاصل ہیں۔ وہ مذہب کی آزادی کا بھی حق رکھتے ہیں۔ ازروئے قانون انھیں اسلام کے اظہار و اعلان اور اسلامی عبادات پر عمل کی، اس کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کی آزادی حاصل ہے۔ اسی طرح وہ اسلام کے معاشرتی قوانین نکاح، طلاق، وراثت، ہبہ، وصیت وغیرہ پر عمل کرسکتے ہیں۔ ان حالات میں ان کے لیے ہجرت کا حکم نہیں ہے، بلکہ وہاں قیام پسندیدہ ہے، تاکہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے فروغ کی وہ کوشش کرسکیں۔

۳- حربی کے دارالاسلام میں قیام کا مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ موجودہ دور میں

ایک ملک اور دوسرے ملک کے درمیان آمد و رفت کے کچھ قاعدے ضابطے مقرر ہیں۔ یہ سب کے لیے ہیں۔ ان ہی کے تحت لوگ تعلیم، ملازمت، تجارت، سیاحت، ایک دوسرے سے تعلقات پیدا کرنے، بڑھانے اور خیر سگالی جیسے مقاصد کے لیے بیرونی ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ حالات کے لحاظ سے انھیں مختصر یا طویل مدت تک قیام کی اجازت ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک ملک کا شہری دوسرے ملک کی شہریت وہاں کی سہولتوں اور آسائشوں کے پیش نظر اختیار کرلیتا ہے۔ کبھی اس میں مجبوری کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کا یا مسلم ملک اور غیر مسلم ملک کا بھی فرق نہیں ہے۔ مسلم ممالک کے شہری بھی غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرلیتے ہیں اور وہیں رہ بس جاتے ہیں؟ کیا اسے دارالاسلام سے دارالحرب کی طرف ہجرت کہا جائے گا، یا کم از کم اسے غیر اسلامی قرار دیا جائے گا؟

فقہائے کرام نے اپنے دور کے حالات میں جو احکام بیان کیے ہیں ان میں آج اس طرح کی دشواریاں پائی جاتی ہیں، ان پر اس پہلو سے غور و فکر کی ضرورت ہے کہ کتاب و سنت کا منشا کیا ہے اور وہ کس طرح پورا ہوسکتا ہے؟

دارالاسلام اور دارالحرب سے متعلق جو اہم سوال ابھرتا ہے، جس کا ان کے تعلقات پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے اور جو بڑے دور رس نتائج کا حامل ہے، وہ یہ ہے کہ کیا دارالاسلام آج کے دور میں دارالحرب سے اسلام قبول کرنے یا جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کرے گا اور یہ مطالبہ تسلیم نہ ہو تو اس کے خلاف اعلانِ جنگ کردے گا؟ کیا یہ صریح جارحانہ رویہ نہیں ہے، کیا یہ کسی ملک کی آزادی کو سلب کرنے کی عریاں جدوجہد نہیں ہے، کیا دنیا کا کوئی بھی ملک اسے قبول کرسکتا ہے اور بین الاقوامی قوانین اس کی اجازت دیں گے؟

یہ سوال بڑا بھیانک ہے اور بہ ظاہر اسلام کے موقف کو حق بہ جانب قرار دینا آسان نہیں ہے۔ لیکن یہ سوال اسلام کے موقف کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ابھرتا ہے۔ اس کی یہاں وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

۱- دارالاسلام یا اسلامی ریاست کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے

اسلام کو اللہ کے نازل کردہ واحد دینِ حق کی حیثیت پیش کرے اور اسے قبول کرنے کی دعوت دے۔ یہ دعوت اسی وقت قابل توجہ اور قابل قبول ہوسکتی ہے جب کہ اسے محض ایک دعوی کے طور پر ہی نہ پیش کیا جائے، بلکہ دلائل کے ذریعہ دوسرے ادیان اور نظریات کے مقابلہ میں اس کا برحق ہونا ثابت کیا جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ اسی میں دنیا اور آخرت کی فلاح مضمر ہے اور یہی کامیابی و کامرانی کا واحد راستہ ہے۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ مخاطب قوم اسلام کو قبول کر رہی ہے، یا اس نے اسے رد کر دیا ہے۔

اللہ کا دین بے شک دوسرے ادیان پر غالب آنا چاہتا ہے، لیکن یہ غلبہ محض سیاسی نہیں، بلکہ دلائل و براہین کا غلبہ بھی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دلائل و براہین کا غلبہ ہی حقیقی معنی میں سیاسی غلبہ کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اللہ کا قانون بھی یہی ہے۔ اس کے رسول اپنی قوم کے درمیان دلائل کے ذریعہ اسلام کا برحق ہونا ثابت کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود جب وہ انکار کرتی ہے تو اس پر اللہ تعالی کا عذاب آتا ہے، اس سے پہلے نہیں آتا۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا۔ (بنی اسرائیل:۱۵)	ہم کسی قوم پر عذاب نہیں نازل کرتے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں۔

فقہاء کے درمیان یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اسلام کی دعوت کے بغیر کسی قوم کے خلاف فوجی اقدام نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ دونوں طرف کی فوجیں محاذ جنگ پر ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوں تب بھی حملہ سے پہلے اسلام کی دعوت ضروری ہے۔ ہمارے خیال میں یہ دعوت دلائل کے ساتھ ہونی چاہیے۔

۲- اسلام اس امر کے خلاف ہے کہ اس کی تعلیمات پر سنجیدگی سے غور وفکر کی جگہ انھیں مذاق کا موضوع بنا لیا جائے، ان کی تصویر مسخ کی جائے، ان پر بے بنیاد اعتراضات کیے جائیں، ان کے بارے میں خواہ مخواہ شکوک وشبہات پیدا کیے جائیں اور دوسروں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ یہی بات آیاتِ ذیل میں بیان ہوئی ہے اور اس پر آخرت کی وعید سنائی گئی ہے۔

...وَوَيۡلٌ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِيۡدِ ۞ نِ الَّذِيۡنَ يَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا عَلَى الۡاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ يَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِىۡ ضَلٰلٍۢ بَعِيۡدٍ ۞ (ابراہیم: ۲،۳)

اور تباہی ہے کافروں کے لیے ایک سخت عذاب کی۔ وہ جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں۔ یہ لوگ گم رہی میں بہت دور جاچکے ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا:

...اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ۞ الَّذِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ يَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ۞ (ہود: ۱۸،۱۹)

سن لو اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔ وہ جو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں۔

۳-اسلام جبر و اکراہ کا قائل نہیں ہے۔ وہ عقیدے اور مذہب کی آزادی کو انسان کا بنیادی حق سمجھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ خود اس کے سلسلے میں بھی یہ آزادی حاصل رہے۔ جو شخص اسے اختیار کرے اسے لالچ، خوف، زور اور طاقت کے ذریعہ منحرف کرنے کی کوشش نہ کی جائے، اس پر ظلم وستم کے پہاڑ نہ توڑے جائیں اور اس کے چاروں طرف حصار جبر نہ کھڑا کر دیا جائے۔ اس ظالمانہ رویہ کے لیے وہ 'فتنہ' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ جو فرد یا گروہ کسی کے خلاف یہ رویہ اختیار کرے، اس کے نزدیک وہ بدترین جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۞ لا النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۞ لا اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ۞ لا وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ؕ ۞ وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۞ لا الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ يَتُوۡبُوۡا

مار ڈالے گئے کھائیوں والے جن میں ایندھن کی آگ تھی اور وہ ان کے کنارے بیٹھے تھے اور اہل ایمان کے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ان سے صرف اس لیے بدلہ لیا کہ وہ اللہ پر، جو غالب اور ستودہ صفات ہے، ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اللہ جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ جن لوگوں نے مومن مردوں

فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ؕ (البروج: ۴-۱۰)	اور عورتوں کو دین سے پھیرنے کی کوشش کی اور سزائیں دیں، پھر توبہ نہیں کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے دہکتی آگ کا عذاب ہے۔

جس ملک میں بھی جبر و اکراہ کی یہ صورت حال ہو، دارالاسلام اسے ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے لیے وہ طاقت بھی استعمال کرسکتا ہے۔ 'اَشْهُرِ حُرُمٌ' میں جہاد پر اعتراض تھا۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ.... (البقرۃ:۲۱۷)	وہ تم سے محترم مہینہ میں جنگ سے متعلق پوچھ رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ اس میں جنگ بڑا گناہ ہے، لیکن اللہ کے راستے سے روکنا، اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے باز رکھنا اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکال دینا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ فتنہ قتل سے بھی بڑا ہے۔

اسی بنیاد پر مکہ جو اس وقت دارالحرب تھا، اس کے کم زور اور بے بس مسلمانوں کو جو ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے، جنھیں قرآن نے مستضعفین کہا ہے وہاں سے نکالنے کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا۔ (النساء:۷۵)

دارالحرب میں دعوت و تبلیغ کے مواقع حاصل ہوں، اسلام کی راہ میں دستوری اور عملی رکاوٹ نہ ہو اور آزادی سے اسے اختیار کیا اور اس کی تعلیمات کے مطابق عمل کیا جاسکے تو توقع ہے کہ خود وہاں اندر سے اسلام ابھرے گا۔ اس کے لیے اسے جنگ کی ضرورت نہ ہوگی۔

دنیا کی ہر ریاست کی طرح دارالاسلام کو بھی اپنے دفاع کا حق حاصل ہے۔ اگر دارالحرب کی طرف سے وہ خطرہ محسوس کرے تو دفاعی اقدامات ضرور کرے گا۔ موجودہ دور میں بین الاقوامی معاہدے موجود ہیں جو ایک ملک کو دوسرے ملک پر حملہ سے روکتے ہیں۔ اس طرح کا معاہدہ دارالاسلام بھی کرسکتا ہے۔

☆☆☆